محسنِ انسانیت

از

جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب

[مندرجہ ذیل مقالہ دراصل برادر محترم جناب نعیم صدیقی صاحب کی زیر ترتیب کتاب "محسن انسانیت" کے مقدمے کا ایک حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے سیرت نبوی کے مطالعہ کے لیے ایک صحیح نقطۂ نظر کی نشان دہی کی ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مصنف کو فرصت و اطمینان کے لمحات میسر ہوں اور وہ اپنی اس بیش قیمت تصنیف کو جس کے لیے نہ جانے کتنی آنکھیں منتظر اور کتنے دل بیتاب ہیں، جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں ——ع - ح - ص]

بدقسمتی سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ ہمارے ہاں اُس اسپرٹ اور اس نقطۂ نظر سے کم ہو رہا ہے جس سے ہونا چاہیے۔ ہماری دلچسپی اس میدان میں پوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہمیں وہاں سے ایک نقشۂ زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنا ہے، بلکہ بعض دوسری دلچسپیاں بیچ میں آگئی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ساری دلچسپی مجرّد حصولِ ثواب کے لیے کرتے ہیں (اس سے انکار نہیں کہ حضورؐ سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیے۔ لیکن ایسی کوشش کا اوّلین مدعا زندگی کو سنوارنا بھی تو ہو)۔ دھوم دھام سے میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور اس اعتقاد سے کی جاتی ہیں کہ ان مجالس میں حضورؐ کی روح پرنور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی محبت کے مظاہرں کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرنی کے طشت، پھولوں کے گجرے اور ہار، قوّالی اور نعت خوانی

کے اہتمام، اگربتیوں اور لوبان کی خوشبوؤں کے مرغولے، قمقموں اور فانوس کی لمعہ پاشیاں، یہ سب کچھ اسی اعتقاد کے ترجمان ہیں۔ سیرتِ نبویؐ سے اس انداز کی عقیدت جو نقشہ سامنے لاتی ہے وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں، گوشت پوست سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا ہے، جس کے جسم کا سایہ نہیں، جس کے کارنامے میں سارا پارٹ معجزوں کا ہے، جو عالمِ اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے، جس کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہر بات اور ہر چیز پُراسرار ہے۔ انکار نہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلہ میں حضورؐ کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے وہاں بہت سی فوق العادہ چیزیں بھی ملتی ہیں، وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں ــــ مگر بہرحال وہ پاک زندگی ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانینِ فطرت اور نوامیس تاریخ و مدنیت ہی کے دائرے میں سارا کام ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چپے پر قربانیاں پیش کی جاتی ہیں وہ ایک انسان کی زندگی ہو کر ہی ہمارے لیے اسوہ بنتی ہے اور اسی تصور کے ساتھ ہم اس سے اکتساب کر سکتے ہیں، اس سے عزم و ہمت کا درس لے سکتے ہیں، اس سے اصول کی پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں، اس سے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں اور اس سے بدی کی طاقتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لیے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ سیرتِ نبویؐ کو اگر تم معجزہ بنا دوگے اور اگر اسے فوق الانسانی کارنامے کا رنگ دے دوگے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے سامنے ہم مرعوب اور حیرت زدہ تو ہو سکتے ہیں اس کا کوئی پرتو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے ہیں، اس کا اتباع نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے وہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے، عملی زندگیاں اتباعِ نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ الٹا حالت یہ ہے کہ گھناؤنے معاشی و معاشرتی

جرائم کے میکدے ہیں جو لوگ خم کے خم لنڈھاتے ہیں وہ اس سستے طرز سے مظاہرہ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ؎

"کچھ بھی ہیں، لیکن تیرے محبوب کی امت میں ہیں"

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان آگھسا ہے، جسے اعاظم پرستی (HERO WORSHIP) کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تفاخر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کراتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی ہستیاں ہیں، ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور جو ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایامِ وفات، ایامِ پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے۔ مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ نہیں بنتے۔ انسانیت کے جن نمونوں کو بصد تفاخر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ان کا کوئی پرتو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پرتو کو اخذ کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ اس رجحان کے تحت حضورؐ کی یاد تازہ کرنے کے لیے جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کہی جاتی ہیں مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطۂ نظر وہ ہے جو حضورؐ کے پیغام کو ایک نظامِ حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ بس چند اعتقاد، چند رسومِ عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے۔ اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر مسلمانی کی شان پیدا کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوں۔ ایسا عنصر

حضورؐ سے بس طہارت، نماز روزے، نوافل و اذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک اکتسابِ فیض کرتا ہے، لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں وہ پوری شانِ بے حسی کے ساتھ ہر باطل کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری کر لیتا ہے۔ اس عنصر نے گویا سیرتِ نبویؐ کی مقدس کتاب کے بے شمار زریں ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر نے اب تک حضورؐ کی جو ترجمانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دورِ حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا، خود تعلیم یافتہ نوجوان مسلم تک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضورؐ ان کے لیے قافلہ سالارِ تمدن بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل بھی مل سکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی حضورؐ کی ہستی کے لیے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہائے نظر نپپ اس لیے رہے ہیں کہ فضا ان کے لیے سازگار ہے۔ فضا یوں سازگار ہے کہ جس نظامِ سیاست و تمدن اور جس ہیئتِ معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں اسے ایک خاص نقشے کا انسان درکار ہے۔ اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و کردار سے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نمونۂ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرتی ہے اور اس منڈی میں اس متاعِ فکر و عمل کی مانگ ہی نہیں ہے جو آنحضورؐ کی زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا اجتماعی نظام جس طرز کے وزیر اور حکام، جج اور وکیل، لیڈر اور صحافی، سپہ سالار اور سپاہی، کوتوال اور پیادے، تحصیل دار اور پٹواری، ڈپٹی کمشنر اور نمبردار، زمیندار اور مزارع، مصنف اور ادیب اور عام قلی اور مزدور مانگتا ہے اُن کا نقشۂ انسانیت اس سے بالکل متضاد قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کے اسٹیج پر فرمایا۔ چھائے ہوئے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماؤں کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت بیس بیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پرزے بنا رہے ہیں اور اسی کے تقاضوں کے تحت ہر

صاحبِ شعور خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ جن جن چیزوں کو حقارت و کراہت سے دیکھتا ہے، ماحول کی پوری طاقت ان کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں، یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود زیبِ بدن ہونے لگتے ہیں، یہ ایک اشارہ کرتا ہے تو قدیمی حیادار گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے چہروں سے نقابیں اُلٹ جاتی ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے جسے مروجہ نظام رائج کرنا چاہے اور ذلّت کا طرز وہ قرار پاتا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعۂ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ نذرِ تغافل ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بناتا اور تمام افراد سے انہیں منواتا ہے اور دوسری تمام روایات، اقدار اور شعائر کو مرجھا جانا پڑتا ہے۔ کچھ حمیت دار افراد اور خاندان ماحول کے جبری دھارے کے خلاف زور کرتے ہیں، مگر معاشی محرومی، ثقافتی پسماندگی اور احساسِ کہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیراک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں، ورنہ ان کی اگلی نسل ہمت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے منشا کے مطابق کرنے میں مگن ہے۔ وہ سرورِ عالم کی سیرت پر کتابیں اگر لکھے اور پڑھے گی اور وعظ سنائے اور سنے گی تو اسوۂ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر آئے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرتِ نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سودے کسی باطل سے چک گئے ہوں۔ یہ لوگ سیرت پڑھ کر سر دھنتے ہوں گے، ان کو ذہنی حظ ملتا ہو گا، ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو گا لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا جمود کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستانِ حیات رستم و سہراب کا قصہ نہیں الف لیلہ

کی کہانی نہیں اور کسی خیالی کردار کا افسانہ نہیں۔ اس کا مقام یہ ہرگز نہیں کہ اسے ہم علم وادب کی تفریحی چہل پہل کا محض ایک سرمایۂ رونق بنائیں۔ اس کی قدر وقیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف غلط نقطہ ہائے نظر ہمارے یہاں مل جُل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہوتے ہونگے؟ ایک ربیع الاول ہی کے مہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا میں لہریں اٹھا دیتی ہونگی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہونگی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے؟ شعرا کتنی نعتیں لکھتے ہوں گے اور قوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہونگے؟ اکابر کی طرف سے کتنے ہی پیغامات اور بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور ضیافتوں کی کیسی کچھ بہاریں دستر خوانوں پر آتی ہوں گی؟ بازاروں کو سجانے اور دروازے اور محرابیں بنانے میں کتنا روپیہ کھپا دیا جاتا ہوگا؟ [۱]

لیکن دوسری طرف یہ بھی تو ذرا سوچیے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جائزہ کی ترازو کے ایک پلڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھیے اور دوسرے پلڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچیے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہونگے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرتِ نبوی کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی مہم میں ہر سال لگ جاتے ہونگے؟ اگر ایک جلسے اور ایک مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوتا تو اندازہ کیجیے کہ گذشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہیے تھا؟ اور اگر عملاً حاصل

---

[۱] آہستہ آہستہ نبی اکرمؐ کی یادگار تقریبوں میں مسرت و تفریح اور کھیل تماشوں کا عنصر بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ بلکہ کھلے کھلے ہنگامہ ہائے فسق و فجور بھی عمل میں آنے لگے ہیں یعنی معاشرہ ٹھیک اس پیغام کے اُلٹی سمت چل پڑا ہے جو سیرت میں مضمر ہے۔

وہ نہیں ہے تو کہیں نہ کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی ہے
میرا حاصلِ مطالعہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعۂ سیرت کا صحیح بنیادی نقطۂ نظر گم کر دیا ہے
اور اوپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کار فرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ کی محبت و عقیدت کے
بے شمار مظاہر موجود ہونے کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے
افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا جس کا نمونۂ کامل حضورؐ پاک نے پیش فرمایا تھا۔

حضورؐ کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتی کہ ہم اسی نصب العین کے لیے ویسی ہی جد و جہد کرنے اٹھیں جس کے لیے حضورؐ کی پوری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جد و جہد اپنے ڈھب کی سیرت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے اور مصرف بھی!!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے جو کنارے بیٹھ کر محض اپنی انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کی آپ بیتی ہے جو ایک اجتماعی تحریک کی روح رواں تھی۔ وہ محض ایک انسان کی نہیں، ایک انسان ساز کی روداد ہے۔ وہ عالمِ نو کے معمار کے کارنامے پر مشتمل ہے۔ ایک پوری جماعت، ایک انقلابی تحریک اور ایک ہیئتِ اجتماعیہ اس کارنامے کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ سرورِ عالم کی سیرت غارِ حرا سے لے کر غارِ ثور تک، حرمِ کعبہ سے لے کر طائف کے بازار تک، امہات المومنین کے حجروں سے لے کر میدان ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نقوش بے شمار افراد کی کتابِ حیات کے اوراق کی زینت ہیں۔ ابو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ، عمارؓ و یاسرؓ، خالدؓ و خویلدؓ اور بلالؓ و صہیبؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب ایک ہی کتابِ سیرت کے اوراق ہیں۔ ایک چمن کا چمن ہے کہ جس کے لالہ و گل اور نرگس و نسترن کی ایک ایک پتی پر اس چمن کے مالی کی زندگی مرقوم ہے۔ وہ قافلۂ بہاری وقت کی جس سرزمین سے گزرا ہے اس کے ذرّے ذرّے پر نکہت کی مہریں ثبت کر گیا ہے۔

دنیا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد بنا کے پیش کیا جائے اور سوانح نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں، اس کی نمایاں مہمات اور اس کے اخلاق و عادات کو بیان کر دیا جائے، کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھوج کرید کر دی جائے تو ایسی سیرت نگاری سے صحیح منشا ہرگز پورا نہ ہو گا۔

پھر سرورِ عالمؐ کی زندگی کی مثال ایک جوہڑ کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے ڈالیں۔ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے، روانی ہے، کشمکش ہے، موج و حباب ہیں، سیپیاں اور موتی ہیں، اور جس کے پانی سے مردہ کھیتیوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے۔ اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں، لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی، جذبے انگڑائی نہیں لیتے، عزم و ہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا، ذوقِ عمل میں نئی حرارت نہیں آتی، ہماری زندگیوں کا جمود نہیں ٹوٹتا۔ وہ شرارِ آرزو ہم اخذ نہیں کر پاتے جس کی گرمی نے ایک یکہ و تنہا اور بے سر و ساماں فرد کو قرنوں کے جمے ہوئے فاسد نظام کے خلاف معرکہ آرا کر دیا۔ وہ سوز و سازِ ایماں ہمیں نہیں ملتا جس نے ایک یتیم بے نوا کو عرب و عجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضورؐ معروف اصطلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک "بڑے آدمی" نہ تھے۔ آپؐ کی سیرت ایک ایسے "بڑے" یا "مشہور" آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی سلسلوں میں گنوایا جاتا ہے۔ یہ ہستی "بڑے" اور "مشہور" آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔

دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی، وہ بھی ہیں جنہوں نے اخلاق و قانون کے نظام سوچے، وہ بھی ہیں جنہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے ملک فتح کیے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑی، وہ بھی ہیں جنہوں نے سلطنتیں چلائیں، وہ بھی جنہوں نے فقر و درویشی

کے عجیب عجیب نمونے ہمارے سامنے پیش کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا — مگر ایسے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا رس زندگی کی کسی ایک شاخ نے چوس لیا اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔ ایک پہلو اگر بہت زیادہ روشن ملتا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے، ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط! لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے اور پھر ہر گوشہ ایک ہی طرح کے کمال کا نمونہ ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے، روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے، معاد ہے تو معاش بھی ہے، دین ہے تو دنیا بھی ہے۔ اک گونہ بے خودی بھی ہے مگر اس کے اندر خودی بھی کارفرما ہے۔ خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ بندوں کے لیے محبت و شفقت بھی ہے، کڑا اجتماعی نظم ہے تو فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے، گہری مذہبیت ہے تو دوسری طرف ہمہ گیر سیاست بھی ہے قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ ازدواجی زندگی کا کھٹراگ بھی نہایت خوبصورتی سے چل رہا ہے، مظلوموں کی دادرسی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپؐ کی سیرت کے مدرسے سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر ایک مزدور، ایک جج، ایک معلم، ایک واعظ، ایک لیڈر، ایک ریفارمر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی یکساں درسِ حکمت و عمل لے سکتا ہے۔ وہاں ایک باپ کے لیے، ایک بیٹے کے لیے، ایک بھائی کے لیے، ایک شوہر کے لیے، ایک دوست کے لیے، ایک ہم سفر کے لیے، ایک پڑوسی کے لیے یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درس گاہ تک آ پہنچتا ہے، پھر اسے کسی دوسرے دروازے کو کھٹکھٹانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے اسی لیے میں اس ہستی کو "انسانِ اعظمؐ" کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسانِ اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوانِ حیات کو روشن کر سکتے ہیں۔ کروڑوں

افرادِ انسانی نے اس سے روشنی لی، لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و عمل کے دیے اسی کی لَو سے جلائے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دیس دیس کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں۔ کوئی انسان نہیں جو اس "انسانِ اعظم" کا کسی نہ کسی پہلو سے زیرِ بارِ احسان نہ ہو ــــ لیکن اس کے احسان مند اس کو جانتے نہیں، اس سے تعارف نہیں رکھتے

اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی، لیکن وہ جماعت خود ہی اُس سے اور اس کے پیغام سے دُور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں، لیکن اس کی کھلی ہوئی کتابِ عمل کے اوراق پر انسانِ اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اس جماعت اور قوم کی مذہبیت، اس کی سیاست اس کی معاشرت، اس کے اخلاق، اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس سیرت کے بہت ہی دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چپے پر بھی یہ گواہی نہیں دیتا کہ میں محمدؐ کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات و اقدار کا آئینہ دار ہوں۔ بلکہ اُلٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو ہو کر اپنے سرمایۂ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ دیا اور انسانِ اعظم کی سیرت کا گلدستہ بنا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی و قومی جتھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی ہستی کے پیغام اور نمونۂ حیات کو گروہی اجارہ بنا لیا۔ حالانکہ آپ ساری انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لیے پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت سیرت کو اس انداز سے پیش کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے ابنائے نوع

کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور مسائل کے گوناگوں خارزاروں سے نجات پاکر ایک پاکیزہ نظام زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضورؐ کا پیغام اور اُسوہ درحقیقت سورج کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں کی طرح کا فیضانِ عام تھا، لیکن اسے ہم نے اپنی نااہلی سے گروہی خول میں بند کر لیا۔ آج افلاطون، سقراط، ڈارون، میکیاویلی، مارکس، فرائڈ اور آئنسٹائن سے تو ہر ملک و مذہب کے لوگ تھوڑا یا بہت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کارفرما نہیں ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور علم اور رہنمائی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمدؐ تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ، اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ہادی و رہبر سے ہمارا کیا واسطہ! افسوس ہے کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جا پہنچنے میں ہمارے اپنے طرزِ عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خود ہم ہیں کہ جنہوں نے محسن انسانیتؐ کی نہایت غلط نمائندگی کی ہے۔

سرورِ عالمؐ کی ہستی تاریخ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بعثت محمدیؐ کے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی، جاگیردارانہ، بادشاہتی اور روایتی و اوہامی دورِ تمدن پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ سامنے دیکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی، عوامی و جمہوری، عقلی و استدلالی، ترقیاتی و ایجادی دورِ تمدن کی پہلی شعاعوں کا قافلہ دور کے افق سے اُمڈتا دکھائی دیتا ہے۔ اس دورِ عقل و ترقی کا افتتاح خود سرتاجِ انسانیتؐ ہی کے ہاتھوں کرایا گیا اور آنے والے دور کے لیے ایسے اصول دنیا کو فراہم کر دیئے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھایا گیا جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضورؐ کے ذریعے اسی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے روح اور بدن، اخلاق اور مادیت، عقلیت، اور جذبات، اعتقاد اور عمل، خواہش اور فرض، فرد اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کرا دیا گیا۔ آپؐ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی

کرتی تھی، ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی اور دوسری طرف مادہ پر کارفرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی، ایک طرف حق کے مقابلے میں انتہائی عاجزی سے سر جھکا دینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے والی تھی، ایک طرف اپنے آپ کو رضائے الٰہی کی تحویل میں دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاق و چوبند تھی۔ یہ طاقت جونہی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم و حکمت کے فانوس روشن کر دیئے، اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیئے اور اس نے ادارات کی تنظیم کے نئے نئے تجربات نہایت تیزی سے کر ڈالے اور اس کی ساری حرکت، اس کی ساری ترقیات، اس کے علوم اور ایجادات، اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی، محمدؐ اور اس کے پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکے۔ وہ ہستی جس کا کارنامہ مغرب کی نشأۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح (REFORMATION) کی تحریک کی ڈور ہلانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان نہ دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا! اس کے کئی اسباب ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر کریں:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپؐ کو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا۔ دونوں مذہب اس وقت فساد اور انحطاط کے افسوسناک دور سے گزر رہے تھے، ایمانی و اخلاقی روح سے خالی ایک رسمیاتی ڈھانچہ شانِ تقدس کے ساتھ دونوں کے ہاں کھڑا تھا، دونوں گروہوں میں مذہبی طبقات پیدا ہو چکے تھے اور انہوں نے کاروباری ذہن کے ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع لٹ چکی تھی، صرف باہر چمکدار سائن بورڈ آویزاں تھے سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں کو اس کے دائرے میں روک رکھنے

پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح اور آدمیت کا بھلا کسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان حالات میں بہ حیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انہوں نے محمدؐ کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کر لیئے۔ اس کی دعوت کا مقابلہ کیا، اس کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے، اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں، اس کی تعمیر کو ڈھا دینا چاہا اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھولیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا حرکات سے گدلا کیا اور یہی گدلا پانی بہ بہ کر بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی ردعمل آج تک ان کے اخلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے

۲۔ اسلام سے قبل کی انسانی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی امنگیں کام کرنے کے لیے بڑی وسیع جولانگاہ سامنے رکھتی تھیں۔ لیکن اسلام کے ابھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آ ابھری اور آہستہ آہستہ نشوونما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی۔ اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگیں کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے ردعمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا۔ تاریخ کے میدان میں کھلے اور برابر سرابر کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس مین اسپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چڑ پیدا کر لی۔ یہ کد اور چڑ بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ صلیبی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہا تک جا پہنچا۔ اس دور تک آتے آتے

چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لیے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے راہ رویاں اسلام اور سرورِ عالم کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرتِ محمدیؐ کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

۳۔ اسلام اور عیسائیت کے اس پہلے دورِ کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لیے ہوئے تھا اور اسلام اسی گروہ کے طبقاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب ہوا تھا، اس لیے اس گروہ نے محسن انسانیت اور اس کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے گلی گلی پھیلایا۔ قرنوں کے اس پروپیگنڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے اربابِ عقل تک جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں سے ذہنی سطح میں کچھ بھی بلند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اٹھا کے دیکھ لیجیے مستشرقین کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے۔ کوئی ایک آدھ استثنائی مثال مل جانا اور چیز ہے، یہاں تو اس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہلِ مغرب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

۴۔ گذشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپیریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان قومیں اسلام سے انحراف، خدا سے بغاوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے گریز کی سزا پانے کے لیے ایک ایک کر کے مادہ پرست مغرب کے شہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں۔ مغرب کے شہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک سخت درجہ کی مزاحم روح کارفرما ملی اور یہ روح ہر جگہ مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے اصول ابھارتا ہے کہ جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپیریلزم کے خلاف جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام کر رہی تھی ہر جگہ دینی شخصیتیں

رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظام اسلامی کے احیاء کے ولولے کارفرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آزادی میں دینی داعیہ پورے زور سے برسرِ عمل ملتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف ازسرِنو ایک چڑ پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی اور بار بار ناقابلِ تسخیر ولولے اُبھارتی تھی۔ چنانچہ اس چڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا اور "ملازم" کو ایک خوفناک ہوا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی رُوحِ دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی کہ جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے شکست کھانے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر ہر دیس میں اس کا مقابلہ کیا ہے۔ تعلیم اور لٹریچر اور اثراندازی کی پوری قوتیں صرف کر کے مغربی امپیریلزم نے برسوں میں جا کر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی اور اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری، سیاسی و تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اسے پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھچاؤ بڑھتا ہی گیا۔

۴۔ مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو ان کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے پست ہے وہ اس سے نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کا درس لے سکیں اور اسے برپا کرنے والی ہستی کا احترام کر سکیں۔ پھر جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مرعوبیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کو اسلام کو مغربی نقطۂ نگاہ کے مطابق ڈھالنے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان کی نگاہوں میں اور کم ہو گئی۔ مسلمانوں کے معذرت خواہانہ نقطۂ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مغرب کے انسان کے درمیان

آہنی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آج مغرب محسنِ انسانیتؐ کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطۂ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مخالفانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے، جس کی ساری تگ و دو لاشعوری محرکات کے ردِ عمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے، وہ تیغِ خونخوار ہاتھ میں لیے جدھر بڑھتا ہے قتلِ عام کرتا چلا جاتا ہے۔ اس پیکرِ رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کا مرتبہ دے دیا گیا ہے اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریکِ اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے مستعار لیے گئے تھے، ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اپنا کوئی جوہرِ قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض نمائشی تھا اور محض ڈرامائی تدابیر سے تسخیرِ عوام کرکے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جیسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہوگا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جا سکتا ہے جس کا تجربہ ہمیں سرورِ عالمؐ کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحبِ دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کرکے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کیے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے نہج پر جزئیاتی مسائل کی چند کونپلوں کو لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ داعیٔ اسلام نے تعددِ ازدواج کو جائز رکھا۔ مذہب کے لیے تلوار اٹھائی۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور فلاں موقع پہ یوں کیا اور فلاں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریقِ مطالعہ ہمیشہ متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے ذریعے کسی نظامِ زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریہ اساسی ہے کہ وہ کہاں تک برحق ہے۔ اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس نظریہ سے ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پر زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کے فریم میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہوتی ہے کہ نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ لے کے آتا ہے، آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں آپ کے معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ہزار ہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے آتا ہے، آپ اس نقشے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لکیریں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے کی مجموعی ترتیب کو ڈھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آجاتی۔ مغربی نظریات اور نظاموں کو سمجھنے کے لیے اور تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لیے جو انتہائی سائنٹفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے، وہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک باغ پر رائے قائم کرنے کے لیے اس کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے، نہ کہ اس کے اندر کی گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کونپلوں کو سارے باغ سے الگ کر کے زیرِ مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ سیرت محمدی اور پیغام محمدی کے پورے چمن کو دیکھیں اور اس کی مجموعی ترتیب کو سمجھیں، پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ اگر کسی نظام یا نظریے یا تحریک، یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خلاف ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابلِ قدر چیز ہے ہی نہیں اور وہ پورا مجموعہ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔ آخر آپ کا ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی و تاریخی معیار نہیں ہے۔ ممکن ہے بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ، نظام، تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیارِ خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور

سرے سے اس کے بھلے برے کے پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے تو معیار اور پیمانوں کو بالمقابل دیکھ کر جانچنا چاہیے اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت مشخص ہونی چاہیے۔

قرآن، اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو لٹریچر اربابِ کلیسا اور مستشرق مورخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعترافِ حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے میٹھے ڈنک سحر آگیں الفاظ کے پردوں میں رکھ دیئے ہیں کہ آدمی فریبِ نگارش کے اس انداز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار درخشاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جنہوں نے حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کو دلی اعتراف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر وہ خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت دی نہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے "در مدحِ مسلمین" (PRO-MOHAMMADEN) قرار دے کر اس کی وقعت گھٹائی جارہی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ مسلمان مملکتوں سے آج مغرب کی ڈپلومیٹک اغراض وابستہ ہورہی ہیں ان کے تحت ان اقوام کی تالیفِ قلب کے لیے جانے کیا کیا تدابیر اختیار کی جارہی ہیں، لیکن کہیں بھی اس ظلم کی تلافی کی فکر نہیں کی گئی جو سرورِ عالمؐ کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ ضمیر کی آواز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں، نہیں آپ اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اپنے ہی بنائے ہوئے، اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ توڑ کر حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے مآخذ سے روایات نہ لیں جو ایک طرف مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق ناقابلِ استناد ہیں اور جنہیں تاریخی تحقیق کے مسلمہ معیارات قبول نہیں کرسکتے۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایک واقعہ کے اچھے محرکات کو ہٹا کر ان کی جگہ دانستہ مکروہ

محرکات لاکر نہ رکھیں تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ دلائل سے بات کہیں، طنز و تعریض اور توہین و تذلیل کا غیر شریفانہ ڈھب اختیار نہ کریں۔

اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذباتی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضا موجود رہی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شرطِ اول یہ ہے کہ مغرب اسلام قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو صاف کرے۔ ایک نئے ذہن کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے اور وہ نیا ذہن اس کلمۂ سواء یا نقطۂ اشتراک کو سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے جو اہلِ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہے۔ ہمارا کلمۂ سواء ذیل کے مشترک نکات سے بنتا ہے:

— عیسائی، یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں، تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے، تینوں کی عبادات کا طرز ملتا ہے، تینوں کے نزدیک بنیادی اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔

— تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔

تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہلِ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں:

— مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی ترقی کی جو راہیں کھولی ہیں، مسلمانوں کا خالص مذہبی نقطۂ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریات روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ (تھوڑی سی حدود کے ساتھ) دے سکتے ہیں جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعتِ ظرف رکھتا ہے۔

— جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی ہیئتیں استوار کی ہیں پیروانِ اسلام کی فکر میں وہ پہلے سے شامل ہیں۔ بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے[1]۔ نمائندگی و انتخاب، شورائیت، قانون کی عملداری، شہری

[1] بریفالٹ اور لیبان کی شہادتیں موجود ہیں کہ جمہوریت کی روح مسلمانوں ہی سے منتقل ہو کر مغرب تک پہنچی

حقوق اور ان میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے جامۂ عمل پہنایا ہے — اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں!
عالمی کھچاؤ اور بحران کو پیش نظر رکھیے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لیے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے :۔

— اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امن عالم کے مسئلے میں جتنا تعاون مسلمان بہم پہنچا سکتے ہیں اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی گروہ اعتقاداً اتنی محبتِ انسانیت رکھتا ہے اور جہانی وحدت کے لیے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے تو بین الانسانی تصادموں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لیے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام سے وافر حد تک مل سکتا ہے۔

— مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال — یعنی سرمایہ پرستی اور کمیونزم — دونوں کا مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہِ عدل پر انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس کے پیروؤں ہی سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

غور و فکر کے لیے یہ مشترک نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہلِ مغرب اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بدلیں۔ کیوں نہ وہ پادریوں اور مستشرقین کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات کو پارہ پارہ کر دیں۔ آج جبکہ ایک طرف مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے اور اب اس تجربہ کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر یہ شاخسارِ حکمت اب نئی کونپلیں بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو مرکزِ امید بنا کر کچھ اور وقت گذارا جا سکے، دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک فرد کی زندگی کے ایک گوشے میں سکڑ کر رہنا پسند کرتا ہے مگر آگے بڑھ کر زمامِ تمدن ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے کھڑے ہیں لے دے کے ایک مرکزِ توجہ باقی ہے جہاں سے شعاعِ امید پھوٹتی ہے۔ اس کے لیے بھی اگر دلوں کے دروازے بند

کر لیے جائیں تو آخر مریخ سے تو کوئی رہنمائی درآمد نہیں کی جا سکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاریخ ساز، ایک محسنِ انسانیت، ایک قائدِ تمدن، اور ایک انسانِ اعظم کی حیثیت سے جانیں۔ جو روشنی وہاں سے ملتی ہے اس کے لیے دل و دماغ کے دریچے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ سائنٹفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہیے یہ کہ آپ اسلام کو عیسائیت کے ایک فریقِ مذہب کی حیثیت سے نہ لیں بلکہ جمہوریت، اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح کی ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور اس نظام کے موسس کی حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن دورِ تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ اس لحاظ سے جانچیں کہ وہ ایک جہانی ریاست چلانے کے لیے آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونۂ انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جوہری دور کی تہذیب کا کل پرزہ بننے کے لیے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جبکہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دور دور تک کوئی جگنو بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا، پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھلملاتی دکھائی دیتی ہے جو گذشتہ پندرہ چودہ صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ خوب سوچ لیجیے کہ حالات ہمارے سامنے کتنا خوفناک چیلنج لیے کھڑے ہیں اور آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی سکت موجود ہے (باقی)